باب 16

اُردو میں ڈرامے کی روایت

13085CH16

ڈراما یونانی لفظ ہے۔ اس کے معنی 'کر کے دکھانا' ہیں۔ ارسطو ڈرامے کو زندگی کی نقّالی قرار دیتا ہے۔ اس صنفِ ادب میں کسی قصے کو کرداروں، مکالموں اور مناظر کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے یعنی قصّے کے واقعات عملاً کر کے دکھائے جاتے ہیں۔ کرداروں کی ذہنی کشمکش اور ان کے جذبات واحساسات کو جسمانی حرکات اور چہرے کے تاثرات نیز آواز کے اتار چڑھاؤ کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں ڈرامے کی تاریخ سنسکرت ڈراموں سے شروع ہوتی ہے۔ سنسکرت ڈرامے کا سب سے مشہور نام کالی داس ہے۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے اودھ کے آخری تاجدار سلطانِ عالم واجد علی شاہ نے ڈرامے میں خاص دل چسپی لی۔ قیصر باغ، لکھنؤ کے اسٹیج پر ناچ گانے کی محفلیں اکثر ترتیب دی جاتی تھیں۔ 'رہس' کے نام سے ڈرامے بھی کھیلے جانے لگے۔ ان میں بالعموم سری کرشن کی راس لیلائیں پیش کی جاتی تھیں۔

سید آغا حسن امانتؔ (1815-1858) کا ترتیب دیا ہوا رہس 'اندر سبھا' کے نام سے کھیلا گیا۔ یہ واقعہ 1852 کا ہے۔ امانتؔ کی اندر سبھا نے بے مثال مقبولیت حاصل کی۔ اس کے بعد کئی اندر سبھائیں لکھی گئیں۔

امانتؔ سے پہلے ممبئی میں انگریزی ڈرامے اسٹیج کیے جانے لگے تھے۔ ممبئی میں گرانٹ روڈ پر ممبئی تھیئٹر قائم کیا جا چکا تھا۔ انگریزوں کی دیکھا دیکھی کچھ مراٹھی نوجوانوں کو بھی ڈرامے اسٹیج کرنے کا شوق ہوا۔ ایک مذہبی مراٹھی ناٹک کھیلا گیا۔ اس کی مقبولیت دیکھ کر کچھ پارسی رئیسوں کو خیال آیا کہ کیوں نہ اردو میں بھی ناٹک کھیلے جائیں۔ یہ بات 1853 کی ہے جب ایک اردو ڈراما 'راجہ گوپی چند اور جلندھر' اسٹیج کیا گیا۔ ڈرامے کے ذریعے لوگوں کو تفریح کا ایک بہانہ مل گیا۔ پارسیوں نے اسے تجارتی کاروبار کی شکل دے دی۔ ایک کے بعد ایک کئی ناٹک کمپنیاں وجود میں آئیں۔ عوام میں اردو ڈراما مقبول ہوتا گیا۔ بہرام جی فریدوں جی کا ڈراما 'خورشید' اردو کا پہلا ڈراما کہا جاتا ہے جو وکٹوریہ کمپنی کی طرف سے پیش کیا گیا۔ اس کے بعد الفریڈ کمپنی نے اپنا ڈراما 'جہاں بخش گل رخسار' پیش کیا۔ ان ڈراموں کی مقبولیت دیکھ کر دوسرے مصنفین بھی اس صنف کی طرف متوجہ ہوئے جن

میں احسن لکھنوی، رونؔق بنارسی، ونائک پرساد، طالبؔ بنارسی، فضا علی خنجرؔ، حکیم احمد شجاع اور پنڈت نارائن پرساد بیتابؔ بنارسی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اردو کے ابتدائی ڈراموں میں سیّد ابوالفضل کا ڈراما 'صولتِ عالمگیری' اور مولوی احمد حسین کا ڈراما 'بلبلِ بیمار' شامل ہیں۔ اردو میں ڈرامے کی روایت کا باقاعدہ آغاز آغا حشرؔ کاشمیری سے ہوتا ہے۔

آغا حشرؔ کاشمیری (1879-1935) : ان کا نام آغا محمد شاہ تھا۔ وہ ایک کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو بنارس میں آباد ہو گیا تھا۔ آغا حشر بنارس میں پیدا ہوئے۔ نوجوانی میں گھر سے بھاگ کر وہ ممبئی چلے گئے۔ وہاں کاؤس جی کی ڈراما کمپنی میں ڈراما نویس کی حیثیت سے نوکری کر لی۔ اس سے قبل وہ اپنا پہلا ڈراما 'آفتابِ محبت' لکھ چکے تھے جو 1897 میں بنارس سے شائع ہوا تھا۔

کاؤس جی کی کمپنی میں آغا حشر نے 'مارِ آستین'، 'مریدِ شک'، 'اسیرِ حرص' اور 'شہیدِ ناز' جیسے ڈرامے لکھے۔ پھر ان کا تعلق اردشیر بھائی کی کمپنی سے ہو گیا جس کے لیے 'سفید خون' اور 'صیدِ ہوس' لکھے گئے۔ کئی تھیٹر کمپنیوں سے متعلق رہنے کے علاوہ انھوں نے اپنی کمپنیاں بھی بنائیں۔ ان کے لیے آغا حشرؔ نے جو ڈرامے لکھے ان میں 'خوابِ ہستی'، 'خوب صورت بلا'، 'سلور کنگ'، 'یہودی کی لڑکی'، 'بلوا منگل'، 'بن دیوی' وغیرہ شامل ہیں۔ ممبئی سے کلکتہ منتقل ہونے کے بعد انھوں نے 'مدھر مرلی'، 'بھگیرتھ گنگا'، 'بھارت مُنی'، 'ہندوستان قدیم و جدید'، 'ترکی حور'، 'پہلا پیار'، 'آنکھ کا نشہ'، 'بھیشم پرتگیا' وغیرہ مختلف ڈرامے لکھے۔ اس کے بعد انھوں نے بنارس میں 'دی گریٹ شیکسپیئرین تھیئٹر کمپنی' کے نام سے اپنی کمپنی قائم کی اور اس کے لیے 'سیتا بن باس'، 'رستم سہراب'، 'دھرمی بالک'، 'بھارتیہ بالک'، 'دل کی پیاس' جیسے ڈرامے لکھے۔ یہ تمام ڈرامے بڑے اہتمام سے اسٹیج کیے گئے۔ ان کے وجہ سے آغا حشرؔ کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ عوام میں وہ دور دور تک انڈین شیکسپیئر کے نام سے مشہور ہو گئے۔ آخر میں وہ کولکتہ سے لاہور چلے گئے تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ آغا حشر نے انگریزی کے بعض ڈراموں کے تراجم بھی کیے تھے۔ یہ ترجمے اتنے آزاد تھے کہ ان میں اصل انگریزی ڈراموں کی تھیم ہی بدل گئی تھی۔

آغا حشرؔ کا دور اسٹیج کی ترقی اور شہرت و مقبولیت کے اعتبار سے اردو ڈراموں کا سنہرا دور کہا جاتا ہے۔ اس عہد میں ان کے علاوہ اور بھی کئی لوگ ڈرامے لکھ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ آغا حشرؔ سے پہلے ہی ڈراما نگاری کی دنیا میں اپنا سِکّہ جما چکے تھے۔ ان میں رونؔق بنارسی، حسینی میاں ظریؔف، ونایک پرشاد طالبؔ بنارسی، حافظ محمد عبداللہ،

مرزا نظیر بیگ اکبرآبادی، محمد عبدالوحید قیس، نرائن پرشاد بیتاب بنارسی، سید عباس علی عباس، منشی احسن لکھنوی اور مراد لکھنوی وغیرہ شامل ہیں۔ کچھ لوگوں نے آغا حشر کے ساتھ یا ان کے بعد اس میدان میں قدم رکھا۔ ان میں محمد عبدالعزیز فائق لکھنوی، اصغر نظامی، میر غلام عباس، نورالدین مخلص حیدرآبادی، غلام محی الدین نازاں دہلوی، ماسٹر رحمت علی، آرزو لکھنوی، آرزو بدایونی، مائل دہلوی، نیر دہلوی، آغا شاعر قزلباش، منشی دل لکھنوی، رادھے شیام کتھا واچک وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

آغا حشر کے عہد کی یہ خصوصیت بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس زمانے کے ڈراموں نے تفریح مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ عوام کو بیدار کرنے میں بھی زبردست رول ادا کیا۔ سماج کے ہر طبقے کے لوگ اس میں دل چسپی لینے لگے۔ اب ڈراما نگاوں نے مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں کو بھی اپنے ڈراموں میں ابھارنا شروع کر دیا۔ اس معاملے میں آغا حشر سب سے آگے رہے۔ ان کا ڈراما 'یہودی کی لڑکی' حکومت کے جبر کے خلاف احتجاج کی ایک خوب صورت مثال ہے۔ دوسرے ڈراما نگاروں نے بھی اس طرف توجہ کی جس سے سماج کی اصلاح اور ملک کی آزادی کے لیے عوام کے جذبات و احساسات کو بیدار کرنے میں کافی مدد ملی۔

اردو اسٹیج، آغا حشر کے بعد

آغا حشر کے زمانے میں ہی ہندوستان میں خاموش فلمیں بننا شروع ہو گئی تھیں۔ فلموں کے چلن اور مقبولیت نے اردو اسٹیج کو نقصان پہنچایا۔ ڈرامے اور اسٹیج کے شائقین کو فلموں نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ بولتی ہوئی فلموں (Talkie) کی آمد سے اسٹیج کی مقبولیت اور کم ہو گئی۔ ایک ایک کر کے کئی ڈراما کمپنیاں بند ہو گئیں۔ کچھ کمپنیوں نے تھیٹر کی جگہ سنیما ہال بنوا لیے۔ اردو میں یوں بھی اسٹیج سے دل چسپی رکھنے والے کم تھے۔ ڈراما لکھنے والے اسٹیج سے الگ ہٹ کر کتابی قسم کے ڈرامے لکھنے لگے۔ اب ڈرامے دیکھنے کے بجائے پڑھنے کی چیز بن گئے۔

اس قسم کی تبدیلی کے باوجود محمد ابراہیم محشر انبالوی، کاظم حسین نشتر لکھنوی اور حکیم احمد شجاع وغیرہ نے آغا حشر کی روایت قائم رکھی اور ان کے ڈرامے عوام کے لیے اسٹیج کیے جاتے رہے۔ خالص ادبی اور کتابی قسم کے ڈرامے لکھنے والوں میں محمد حسین آزاد، عبدالحلیم شرر اور مرزا رسوا کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں۔ ادبی ڈرامے کی روایت کو آگے

بڑھانے والوں میں امتیاز علی تاج، مولانا عبدالماجد دریابادی، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، برج نرائن چکبست اور پریم چند کے اہم نام ہیں۔ ادبی اور کتابی مزاج رکھنے والے ڈرامے اسٹیج ڈرامے کی جگہ نہیں لے سکتے تھے۔ اسی لیے اردو اسٹیج کی ساکھ گرنے لگی اور وہ سمٹنے لگا۔

امتیاز علی تاج (1970-1900) : ان کا نام سید امتیاز علی تھا۔ وہ لاہور میں پیدا ہوئے۔ امتیاز علی تاج اپنے والد کے رسالے 'پھول' میں بچّوں کے لیے کہانیاں لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے کئی مزاحیہ فیچر اور چند مزاحیہ مضامین بھی لکھے اور 'چچا چھکن' جیسے کردار کو دوام بخشا۔ لیکن ادبی دنیا میں انھیں اپنے ڈرامے 'انارکلی' کی وجہ سے بلند مقام حاصل ہوا۔

تاؔج نے 'انارکلی' میں مغلیہ عہد کے ایک مشہور روایتی قصّے کو ڈرامے کی شکل دی ہے۔ اس میں مغلوں کی درباری شان و شوکت اور جاہ و جلال کا نقشہ بڑی کامیابی سے کھینچا گیا ہے۔ زبان و بیان شاعرانہ ہے۔ مکالمے جذبات انگیز ہیں۔ تاؔج نے اس ڈرامے میں کش مکش اور تصادم کو فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔

محمد مجیب (1985-1902): وہ بہلول گڑھی، ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ محمد مجیب نے ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں اور ثانوی تعلیم دہرہ دون میں حاصل کی۔ بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی چلے گئے۔ فارسی، لاطینی، روسی اور انگریزی زبانوں پر انھیں قدرت حاصل تھی۔ جرمنی سے واپسی کے بعد جامعہ ملّیہ اسلامیہ سے وابستہ ہو گئے۔

انھوں نے بچّوں کے لیے کئی کہانیاں اور ڈرامے لکھے اور بعض ڈراموں کی ہدایت کاری بھی کی۔ بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی کتاب 'آؤ ڈراما کریں' فنِ ڈراما کو سمجھنے میں مفید اور کارآمد ہے۔ تاریخِ ہند اور فلسفے سے انھیں بڑی دل چسپی تھی۔ ان کے ڈرامے 'خانہ جنگی' میں یہ دونوں عناصر ملتے ہیں۔ خانہ جنگی کے علاوہ 'حبّہ خاتون'، 'آزمائش' 'ہیروئن کی تلاش' اور 'کھیتی' ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔

حبیب تنویر (2009-1923) : حبیب تنویر کا نام حبیب احمد خاں اور تنویر تخلص تھا۔ وہ رائے پور (چھتیس گڑھ) میں پیدا ہوئے۔ ادبی اور ثقافتی دنیا میں وہ حبیب تنویر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ناگ پور یونیورسٹی سے بی۔ اے کرنے کے بعد آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ ابتدا میں انھوں نے فلمی گیت اور مکالمے لکھے پھر کچھ دنوں کے لیے قدسیہ زیدی کے ہندوستانی تھیٹر میں شامل ہو گئے۔ لندن اور جرمنی میں ڈرامے کی تکنیک پر مہارت حاصل کی۔

'اپٹا' (IPTA) کی سرگرمیوں نے حبیب تنویر کو اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ اِپٹا سے وابستہ ہوگئے۔ ان کے ڈرامے آگرہ بازار (1954) کی دہلی میں مقبولیت کے زیرِ اثر حبیب کولندن کی 'رائل اکاڈمی آف ڈرامیٹک آرٹ' میں تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس سے ان کے فن کو جلا ملی اور انھیں دوسرے ممالک میں جا کر ڈرامے پیش کرنے کے مواقع حاصل ہوتے چلے گئے۔ انھوں نے 1969 میں 'نیا تھیٹر' کی بنیاد ڈالی۔ اس تھیٹر کی وجہ سے حبیب تنویر 'لوک کلاوادی' اور 'لوک شیلی' میں ڈراما لکھنے والے کی حیثیت سے ابھرے۔ انھوں نے 'مٹی کی گاڑی'، 'گاؤں کا نام سسرال مور نام داماد' اور 'چرن داس چور' جیسے ڈرامے اسٹیج کیے۔ دہلی میں انھوں نے پریم چند کے مشہور افسانے 'شطرنج کی بازی' کو ڈرامے کی شکل میں ڈھالا۔ حبیب تنویر خود بھی بیشتر ڈراموں میں مختلف کردار ادا کرتے رہے۔ وہ راجیہ سبھا کے ممبر بھی بنائے گئے تھے۔

ابراہیم یوسف (1925-1999) : ان کا نام محمد ابراہیم خاں اور قلمی نام ابراہیم یوسف تھا۔ بھوپال کے ایک معزز پٹھان خاندان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم بھوپال اور اعلیٰ تعلیم اندور میں حاصل کی۔ زمانۂ طالب علمی سے ہی افسانہ نگار کے طور پر اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ محکمۂ تعلیمات، حکومتِ مدھیہ پردیش سے وابستہ رہے اور پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

ان کا اصل میدان ڈراما نگاری ہے۔ ان کے ڈراموں کے سات مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں 'سوکھے درخت'، 'دھوئیں کے آنچل'، 'پانچ چھے ڈرامے' اہم ہیں۔ ایک ناول 'آبلے اور منزلیں' شائع ہوا۔ ڈرامے کے فن اور تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس سے متعلق ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انھوں نے ڈیڑھ سو سے زیادہ یک بابی ڈرامے تحریر کیے ہیں۔ ان کے بعض ڈرامے بھوپال، اندور اور ممبئی میں اسٹیج کیے جا چکے ہیں۔

ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں مدھیہ پردیش حکومت کا 'اقبال سمّان'، 'میر تقی میرؔ ایوارڈ' اور غالب انسٹی ٹیوٹ کا 'غالب ایوارڈ' دیا گیا۔

محمد حسن (1925/26-2010) : محمد حسن اگرچہ ممتاز ناقد کے طور پر زیادہ مشہور ہیں لیکن عصرِ جدید کے ڈراما نگاروں میں بھی ان کا نام امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ ان کا شمار اردو کے ان چند ڈراما نگاروں میں ہوتا ہے جنھیں اسٹیج کا براہِ راست تجربہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اسٹیج کی تمام باریکیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ڈرامے لکھے ہیں، انھوں

نے ڈراما نگاری کا آغاز ریڈیائی ڈرامے سے کیا۔ ان کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ 'پیسہ اور پرچھائیں' کافی مقبول ہوا۔ اس مجموعے میں شامل ڈرامے نہ صرف آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں بلکہ ان میں سے بیشتر اسٹیج بھی کیے جا چکے ہیں۔

محمد حسن ڈرامے کے فن پر جتنی گرفت رکھتے ہیں اتنا ہی بالیدہ ان کا تاریخی، تہذیبی اور سیاسی شعور بھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے ریڈیائی ڈرامے ہوں یا اسٹیج ڈرامے ان سب میں ان کا فنی و فکری شعور نمایاں ہے۔ 'پیسہ اور پرچھائیں' کے علاوہ 'میرے اسٹیج ڈرامے'، 'مور پنکھی'، 'کہرے کا چاند' ان کے ڈراموں کے مجموعے ہیں۔ ان کے علاوہ 'ضحاک' ان کا شاہکار ڈراما ہے جس میں شاہنامے کے ایک کردار کو آج کی صورت حال میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں بھی اسٹیج کے تقاضوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ان کے ڈراموں کے پلاٹ میں کشمکش اور تصادم کا خاص درجہ ہوتا ہے۔ ان کے مکالمے چست، برجستہ اور رواں ہوتے ہیں۔ فکری لحاظ سے ان کے ڈراموں پر ترقی پسندی اور روشن خیالی کا گہرا رنگ ہے۔

ڈرامے کی صنف نے ہمارے زمانے میں ایک نئی معنویت حاصل کی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ آج کی زندگی کے مسائل اور زمینی سچّائیوں کی عکاسی کے لیے ڈراما زیادہ موزوں صنف ادب ہے۔ اسٹیج ڈرامے سے زیادہ عصر حاضر میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے اعتبار حاصل کر لیا ہے۔ ہمارے بہت سے ممتاز لکھنے والوں نے ٹیلی ویژن اور ڈرامے کو ہی اپنی فنکاری کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن دونوں پر بہت دنوں تک ڈرامے لکھنے والوں میں اردو ادیبوں کی اکثریت تھی اور ان میں منٹو اور بیدی سے لے کر اپندر ناتھ اشک، کرشن چندر، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس تک بہت سے معروف لکھنے والے شامل تھے۔ ان کے بعد لکھنے والوں میں رفعت سروش، عمیق حنفی، سلام مچھلی شہری، انور عظیم، شمیم حنفی، اظہر افسر وغیرہ کے نام خاص ہیں۔